تاثرات

سال نو کی آمد اور مسلم دنیا

لیجئے ۲۱ جون ۱۹۹۳ء کو یکم محرم ۱۴۱۴ھ کی صبح طلوع ہوگئی۔ نئے سال کی صبح ایسے وقت میں مسکرائی ہے جب مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور یورپ کے مسلمان ابتلا و آزمائش کی ایک کٹھن منزل سے گزر رہے ہیں اور حیرت و درماندگی کے عالم میں اپنی گم کردہ منزل کی تلاش میں ہیں، لیکن ابھی تک انہیں منزل مقصود کا سراغ نہ مل سکا، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی فکری اور سیاسی قیادت نے سالہا سال سے جن مغربی سرمایہ دارانہ طاقتوں پر اعتماد کر رکھا ہے، وہ بہ وجوہ مسلمانوں کو اپنی آنکھوں کا کانٹا تصور کرتی ہیں۔ چنانچہ یہ طاقتیں نہیں چاہتیں کہ مسلمان، علم و ادب، سائنس و فلسفہ اور اقتصاد و سیاست کے میدان میں ان کی حریف بن کر سامنے آئیں، یہ طاقتیں جانتی ہیں کہ مسلمانوں کی قیادت تن آساں اور عیش کوش واقع ہوئی ہے، جو مسلمانوں کے مسائل، جذبات اور تمناؤں کو غرق مے ناب کر کے نفس پرستیوں میں برابر غرق ہے۔ جسکا نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادی کی کثرت، قدرتی وسائل کی بہتات اور جغرافیائی محل وقوع کی برتری کے باوجود دنیا کے بازار میں ارزاں ہے۔ علم و ادب اور سائنس و فلسفہ میں سب قوموں سے پیچھے ہے اور سیاست اور معیشت کی دنیا میں غریب الوطن ہے، اسے پتہ نہیں چلتا کہ عرب قیادت نے آج مشرق وسطیٰ کے وسائل کو خود اپنے ہاتھوں سے ایک بڑی طاقت کے پاس رہن کیوں رکھ دیا ہے؟ خلیج فارس سے لے کر اٹلانٹک تک پوری عرب دنیا میں ایک سناٹا ہے۔ اسرائیل کے غرور و نخوت کی اکڑی ہوئی گردن مسلمانوں کو قدم قدم پر ذلت و رسوائی کا احساس دلاتی ہے، اسرائیل کے ایک معروف رہنما موشی دیان نے کہا تھا کہ اسرائیل اور عربوں میں فرق یہ ہے کہ اسرائیل ہوائی جہاز میں پرواز کر رہا ہے اور عرب اونٹ پر سوا ہے۔ یہ فرق ہر صورت میں باقی رہنا چاہیے، موشی دیان کے طنزیہ تبصرے کا مقصد یہ تھا کہ اگر عربوں نے عہد جدید میں داخل ہو کر سائنس اور ٹیکنالوجی میں برتری حاصل کر لی

تو پھر عرب اسرائیل کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیں گے۔

ہمیں دیکھ سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مغرب کی سامراجی طاقتوں کی' جن میں بدقسمتی سے امریکہ اور برطانیہ پیش پیش ہیں' برابر یہ پالیسی رہی ہے کہ عرب اڈنٹ ہی کی سواری پر اکتفا کریں اور اسرائیل فضاؤں میں تیرتا رہے' اس پالیسی کو ہم نے بارہا کھلی ننگی جارحیت کے روپ میں بھی دیکھا ہے۔ اس فرق کو ختم کرنے کے لیے جب کبھی عربوں میں کسی اولوالعزم نے آواز اٹھائی تو اسے انہی طاقتوں کے ہاتھوں پابجولاں و'مصر کے بازار' میں چلنا پڑا۔

جمال عبدالناصر کی مثال ہمارے سامنے ہے' وہ قبیلہ مجنوں کا شاید آخری فرد تھا' جس نے مشرق وسطیٰ میں مغرب کی اقتصادی بالادستی کو چیلنج کیا اور اپنے آہنی ارادے اور بے داغ کیریئر کی طاقت سے عربوں کو مغرب کی سامراجی حکومتوں کے جارحانہ عزائم کے سامنے لاکھڑا کیا۔ نہر سویز کی جنگ میں برطانیہ کے ایک ناکام وزیراعظم ایڈن نے مغربی رہنماؤں کو خبردار کرتے ہوئے لکھا تھا:۔ "کیا ہم ان (عربوں) پر یہ اعتماد کرسکتے ہیں کہ وہ جرمنوں سے زیادہ سمجھدار ثابت ہوں گے' اگر بعد میں عربوں میں پھوٹ بھی پڑ جائے جیسا کہ پہلے (عرب) خلفاء کے بعد ہوا' تو بھی اس اثنا میں کافی نقصان پہنچ چکا ہوگا' الغرض ہمیں پورا یقین ہے کہ اگر ناصر کو اٹھارہ اقوام کو ٹھکرانے کی اجازت دے دی گئی تو چند مہینوں ہی میں تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں انقلاب آجائے گا اور مغرب مشرق وسطیٰ کے تیل سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

(تفصیل کے لیے دیکھئے ایڈن کی کتاب Memories)

عرب سٹیج سے جمال عبدالناصر کے ہٹ جانے کے بعد عربوں کو اسرائیل کے ساتھ "معاہدہ امن" کرنے کے لیے مغرب (برطانیہ' فرانس' امریکہ) ہی نے عرب قیادت کو مجبور کیا کہ وہ اپنے تاریخی پیغام اور شعور سے دست بردار ہو کر فلسطین میں اسرائیل کی قیادت کو مان لے اور یروشلم کے بارے میں صلاح الدین ایوبی کی تاریخی روایت سے ہاتھ اٹھا لے۔

مغرب کی سرمایہ دارانہ قیادت کے سامنے عرب قیادت نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال کر جہاں بعض مقامات پر نوجوانوں کے سامنے شدت و انتہا پسندی کی راہ کو کھول دیا ہے' وہاں مصر کے بعض حلقوں میں عبدالناصر کو پھر سے یاد کیا جا رہا ہے۔ غرضیکہ آج جو کچھ سالہاسال سے فلسطین میں ہو رہا ہے' وہی کچھ آج بوسنیا میں ہو رہا ہے۔

بوسنیا میں جس بے دردی سے انسانی وقار کا خون بہایا گیا ہے' اس پر خود مغرب کے عوام' دانشور حتیٰ کہ جرمنی کی حکومت تک تڑپ اٹھی ہے' لیکن مغرب کی "سامراجی" قیادت نے جو روش اختیار کی ہے' اس سے پتہ چل گیا ہے کہ :۔

۱۔ یورپ اپنی تہذیب و کلچر کے درمیان' جس کی جڑیں یونان' روم اور یروشلم کی سرزمین میں پیوست ہیں' کسی ایسی سیاسی طاقت کو' خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو' قبول کرنے کے لیے تیار نہیں' جس کی بنیادی فکر کے رشتے مجازی پیغام سے استوار ہوں۔

۲۔ ادھر ایک سال سے اقوام متحدہ اور سامراجی قیادت بوسنیا کے مسئلے پر "غور و فکر" کر رہی تھی' اس طویل "غور و فکر" اور "مذاکرات" کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ سرب' بوسنیا کے مسلم علاقوں پر ممکن حد تک قبضہ کر لیں اور پھر اس "قبضے" کو "امر واقع" قرار دے کر تسلیم کر لیا جائے۔ ایک سال کی "تگ ودو" کے بعد یہ راز کھلا کہ بوسنیا کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سامراجی قیادت بوسنیا کے بارے میں بہت جلد اپنے عہدو پیمان کو بھول گئی' اگست ۱۹۹۲ء میں لندن کانفرنس میں اعلان کیا گیا تھا کہ بوسنیا میں طاقت کے زور سے جغرافیائی سرحدیں نہیں بدلی جائیں گی۔ نیز یہ کہ بوسنیا اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔ کسی بھی ملک یا گروہ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بوسنیا کے بعد وادی کشمیر میں پوری آبادی موت کے سایہ تلے سفر کر رہی ہے اور غیر جانبدار اور غیر سیاسی مبصرین نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ وادی کشمیر میں انسانی حقوق کو بری طرح سے پامال کیا جا رہا ہے' جس پر ہم المعارف کے گذشتہ شمارے میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

اس دراز نفسی کا مقصد یہ ہے کہ آج یورپ' مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے ساتھ آسمان جو سلوک کر رہا ہے' اس پر ہماری فکری اور اجتماعی قیادت کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ آخر ہم کب تک گردش لیل و نہار کا شکار رہیں گے اور اس گردش سے باہر نکلنے کی کیا راہ ہے؟

ہماری سنجیدگی سے یہ رائے ہے اور ہم نے بار بار لکھا ہے کہ ہمیں اپنے داخلی اور خارجی حریفوں کو پہچاننا چاہیے۔ داخلی حریفوں سے ہماری مراد وہ رجعت پسند طاقتیں ہیں جنہوں نے ہمارے معاشرے میں رشوت' بددیانتی' تشدد' فرقہ واریت اور بداخلاقی کو عام کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ بدی کی ان طاقتوں پر قابو پانے کے

لیے ہمیں اپنے تعلیمی نظام کا بے لاگ جائزہ لینا چاہیے' تعلیمی نظام کو درست اور نالائق و بے ضمیر اساتذہ و طلبہ کا سخت محاسبہ کیے بغیر تعلیمی اداروں کی اصلاح ناممکن ہے' صحیح تعلیم و تربیت کے حصول کے بغیر قومی اصلاح کا ہر دعویٰ مجذوب کی ایک بڑ ہے یا دیوانے کا ایک خواب!

۳۔ ہم نے اوپر مغرب کی سامراجی قیادت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' اس کا تعلق صرف مغرب کی "سیاسی انا" سے ہے' جس کے ہاتھوں اس صدی میں دو بین الاقوامی تباہ کن جنگیں لڑی جا چکیں ہیں' اس "سیاسی انا" سے قطع نظر مغربی قوموں نے فلسفہ' ادب' قانون' سائنس اور سیاست کے میدان میں جو حیرت ناک ترقی کی ہے' اس کا اعتراف مشرق کے تمام دانش مندوں نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے کیا ہے۔ بے شبہ مغرب کے ذوق تجسس اور ذوق عمل نے مشرق کو ایک تازہ ولولہ اور حوصلہ دیا ہے۔ ہمیں اس میدان میں مغرب سے بہت کچھ سیکھنا ہے' اس لیے کہ علم کا کوئی وطن نہیں ہے' پوری دنیا اس کی جلوہ گاہ ہے۔ اگر آج کاروان علم کا پڑاؤ مغرب کی سرزمین ہے تو کل اس کا پڑاؤ مشرق میں ہوگا' بلکہ اہل علم کا کہنا ہے کہ پانچ سو سال کے بعد اب تہذیب و تمدن کا مرکز ثقل اٹلانٹک سے منتقل ہو کر مشرق بعید جا رہا ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ سقوط ماسکو کے بعد اب مشرق بعید سینہ تان کر مغرب کا حریف بن کر میدان میں اترنے والا ہے۔

ہمیں یہاں کہنے کی اجازت دیجیے کہ سویت یونین کے سقوط سے تیسری دنیا اور مشرق وسطیٰ کی قومیں بری طرح سے متاثر ہوئی ہیں' سویت یونین نے دنیا میں طاقت کے توازن کو برقرار رکھا ہوا تھا' جس سے مشرق کی چھوٹی قومیں "سامراجی عتاب" کا نشانہ بننے سے بچ نکلتی تھیں۔ اب سیاست کے میدان مسابقت میں صرف ایک بڑی طاقت کی اجارہ اداری ہے جس کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کی قوموں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ باہمی کشمکش اور اقتدار کے سٹیج پر ایک کا دوسرے کو دھکیل کر نکال باہر کرنا قوموں کی حیات معنوی کے لیے سودمند ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روحانی اور اخلاقی قدریں تہہ و بالا ہو جاتیں' چنانچہ اقتدار پر صرف ایک قوم کی اجارہ داری نہ صرف اصول فطرت کے خلاف ہے' بلکہ مخلوق خدا کے لیے مہلک بھی ہے۔ جس کا مظاہرہ ہم مشرق وسطیٰ میں دیکھ رہے ہیں' جہاں غریب عوام پر فضا سے آگ برسائی جا رہی ہے۔ القصہ ہم داخلی حریفوں پر قابو پائے بغیر اپنی مشکلات کو حل نہیں

کر سکتے۔ ہمیں بہت پہلے تاریخ کے اس فیصلے کو پڑھ لینا چاہیے تھا کہ اجتماعی زندگی میں ایک اخلاقی انقلاب کو بپا اور ایک نئے انسان کی تخلیق کے بغیر نہ صرف ہم عالمی برادری میں کوئی مثبت رول ادا نہیں کرسکتے' بلکہ اپنے وطن میں بھی ہمیں پرامن' خوش حال اور باوقار زندگی میسر نہیں آسکتی۔

چنانچہ نئے سال کی آمد پر ہمیں اخلاص سے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور اس عظیم قربانی کو تاریخ کے صحیح تناظر میں یاد رکھنا چاہیے جو کائنات انسانی کے سب سے بڑے محسن کے نواسے نے اس ماہ دی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ حق و صداقت کی راہ میں "امام حسین کے جسم خوں چکاں سے دشت کربلا میں جس قدر خون بہا تھا' اس کے ایک ایک قطرے کے بدلے دنیا اشک ہائے ماتم والم کا ایک ایک سیلاب بہا چکی ہے۔" امام عالی مقام کے سامنے دو راہیں کھلی تھیں (۱) حق و صداقت کی راہ میں پیش آنے والی ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے قبول کریں اور دنیا کو بتائیں کہ جب انسانی دل حق و صداقت کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے اور بامقصد اور باوقار زندگی کے تصور سے لذت آشنا ہو جاتا ہے' تو پھر وہ دنیا کے ہر فتنے کو پامال کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ (۲) دوسری راہ تن آسانی اور عیش کوشی کی راہ تھی' کہ وہ جبر و استبداد کی طاقتوں سے صلح کر کے عیش و عشرت کی ساری آسائشیں حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسی زندگی کو "موت" سے تعبیر کیا اور اسے اپنے نانا پیغمبر آخرالزمانؐ کی سنت طیبہ کے خلاف جانا۔ چنانچہ انہوں نے وہی کچھ کیا' جو دنیا کے اولوالعزم پیغمبروں اور عارفوں کا شیوہ رہا ہے۔ انہوں نے اس راہ میں جس استقامت' صبر و تحمل اور پیغمبرانہ وقار کے ساتھ ہر آزمائش اور فتنے کا سامنا کیا' اس کا اعتراف آج تاریخ نے دل کھول کر لیا ہے۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم امام حسینؓ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور خدمت خلق کے جذبے سے معمور کریں؟

(رشید احمد جالندھری)